ہتھیلی پہ سورج



ڈاکٹر درخشاں اندرابی

ہتھیلی پہ سورج

ڈاکٹر درخشاں اندرابی

ہتھیلی پہ سورج



ڈاکٹر درخشاں اندرابی

Hatheli Pe Suraj

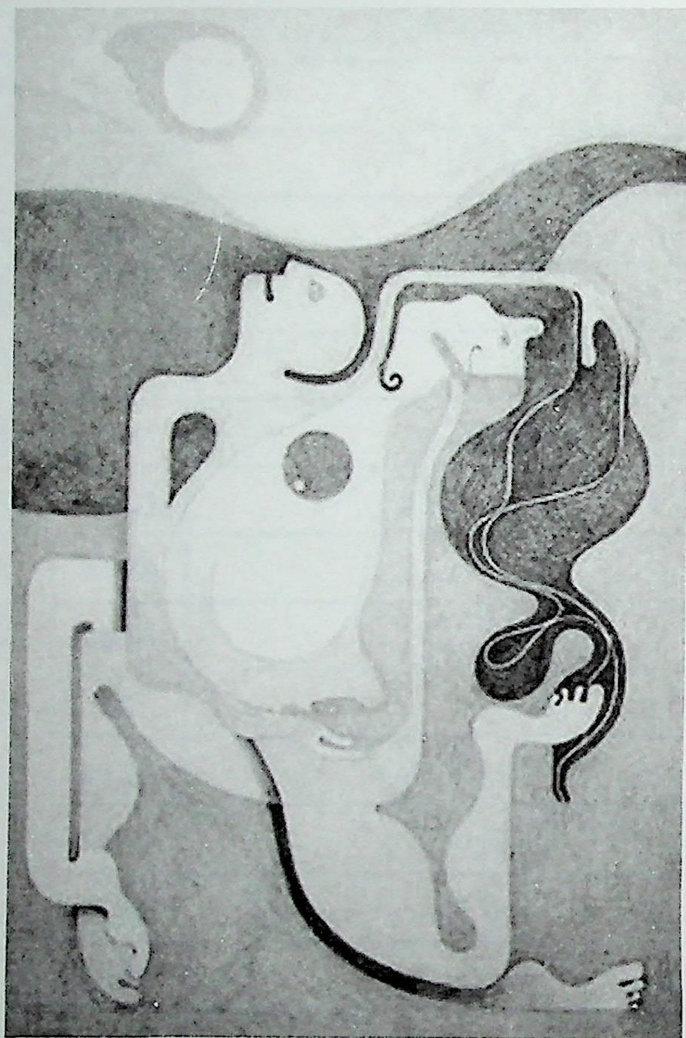
Urdu Poems By Dr. Darakhshan Andrabi

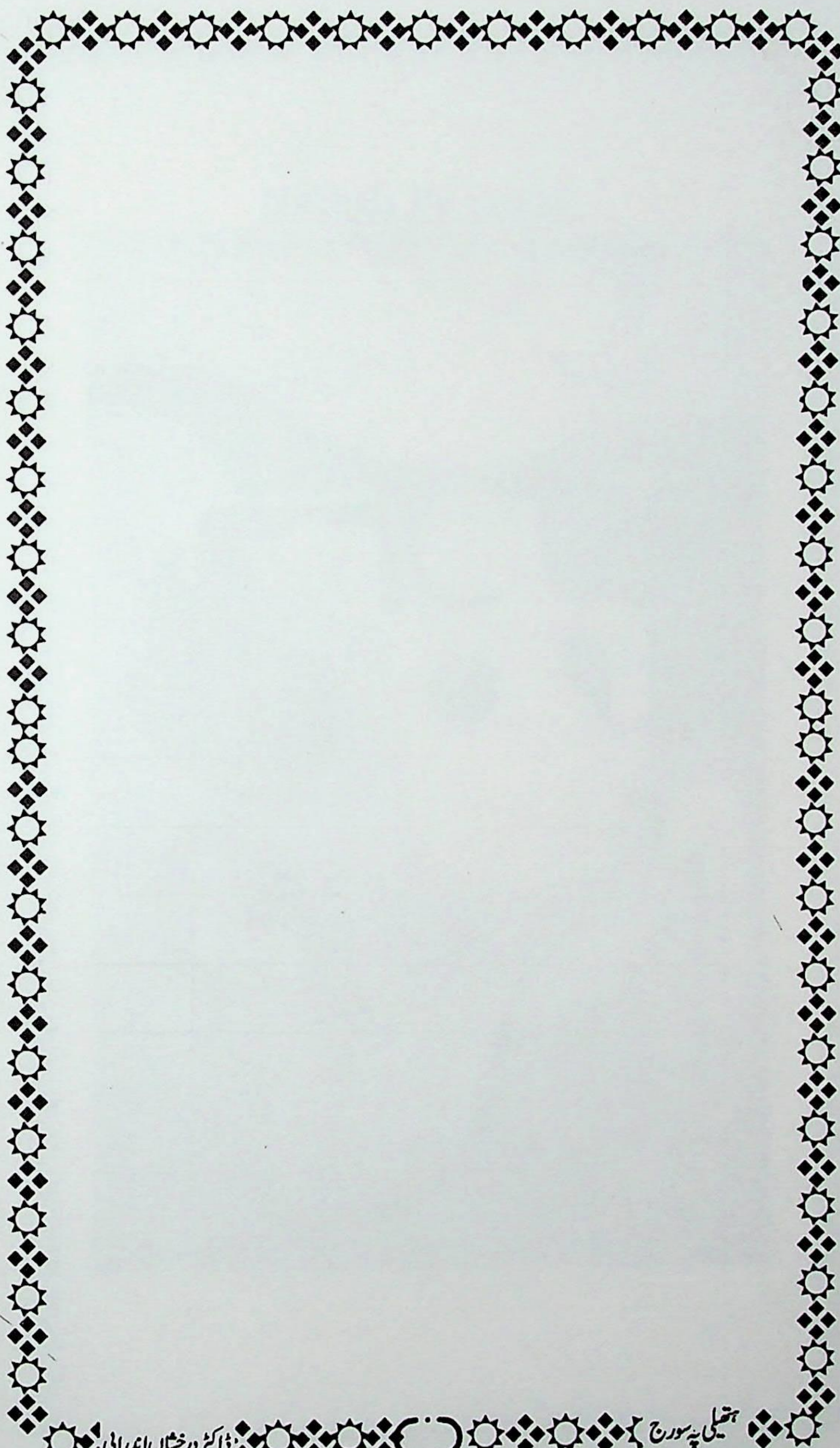
کتاب کا نام	:	ہتھیلی پہ سورج
شاعر	:	ڈاکٹر درخشاں اندرابی
پہلا ایڈیشن	:	2015ء
کمپوزنگ	:	جمیل انصاری
سرورق	:	درخشاں اندرابی
طباعت	:	رہبر آفسیٹ پریس، دہلی-6
قیمت	:	پانچ سو روپئے

ISBN: 978-93-5137-810-5

darakhshaan786@gmail.com

Cell No: 9419021285





ترتیب

جَدِ اَمجد

امام حسین علیہ سلاۃُ و لسّلام کی نذر

الاؤ کی مانند سُلگ رہی نظمیں

درخشاں اندرابی کی نظموں کا ذائقہ بھی خوب اور انوکھا ہے۔ نیم کی کڑواہٹ اور آم کی مٹھاس کو یکجا کر کے ایک نئی عبارت سامنے رکھ دی گئی ہے۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے مجھے بارہا محسوس ہوا کہ وادیٔ کشمیر میں بکھرے ہوئے موجودہ نسوانی کرب واحتجاج کو ایسی زبان دے دی گئی ہے جس کی شعلگی قاری کو جھلساتی نہیں ہے بلکہ چنار کے درختوں کی آگ کا لطف عطا کرتی ہے۔

درخشاں کی یہ نظمیں اس کے روشن اور درخشاں مستقبل کا پتہ دے رہی ہیں۔ اس نے ''ہتھیلی پر سورج'' سجالیا ہے۔ وہ اجالوں کے دیش میں کھڑی دکھائی دے رہی ہے جہاں اندھیرے خود خوف زدہ ہو کر اس کے تعاقب میں ہیں۔ شاید وہ بھی کرن کرن روشنی کے آرزومند ہیں۔

فکر کی وادی میں ہر نظم ایک الاؤ کی مانند سلگ رہی ہے۔ آگ چونکہ برفیلی ہے لہٰذا شاعرہ کے انداز فکر اور طرز بیان میں ٹھنڈے ٹھنڈے سے ٹھہراؤ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ شاعری دراصل ''حالات کشیدہ مگر قابو میں'' والی شاعری ہے۔ بلاشبہ ان نظموں کو پڑھنا مدتوں کے بعد غسل کے لطف کا مترادف ہے۔

چندر بھان خیال

جلال و جمال کی شاعری

وہ ایک غزل ہی تھی جس نے دُخترِ کشمیر درخشاں کا رشتہ ہمارے ساتھ جوڑا تھا اور پہلی ہی ادبی ملاقات میں اِس شاعرہ کی صلاحیتوں کا ہمیں احساس ہوگیا تھا۔ بعدازاں ہم نے اِن کی غزلوں کو کئی کُل ہند مشاعروں اور ادبی تقاریب میں سُنا اور پڑھا بھی۔ اُن کی شُستہ زبان، آسان لہجہ اور فکر انگیز اندازِ بیان انہیں اُردو ادبی دُنیا میں ایک درخشاں مقام عطا کرنے کے لئے کافی ہے۔ درخشاں کی نظمیں بھی اُن کی غزلوں کی طرح ہی اُردو شاعری میں نئے لہجے کی تخلیقات ہیں۔ درخشاں کا اِنسانی نفسیات کا مطالعہ کافی گہرا ہے۔ اُنکی نظموں میں کائینات کے اسرار و رموز عرفان و آگہی کی زبان بولتے ہیں۔ یہ شاعری جلال و جمال کی شاعری ہے۔ اُنکی نظمیہ شاعری بھی ان کی غزلوں کی ہی طرح اِنسانی احساس کو ایک نئی لذّت اور فرحت عطا کرتی ہے۔

مخمورؔ سعیدی

ڈاکٹر درخشاں اندرابی بحیثیت نظم نگار

ڈاکٹر درخشاں اندرابی نہ صرف خطہ کشمیر بلکہ پوری اردو دنیا کی ایک ایسی ممتاز و منفرد شاعرہ اور فنکارہ ہیں جن کے نام کا آفتاب جلوۂ آفاق پر تاباں و درخشاں نظر آتا ہے۔ وہ کئی کتابوں کی مصنف ہیں۔ محترمہ نے یوں تو کئی اصناف سخن میں اپنے آفرید گارانہ، فسوں کارانہ، ہنرورانہ، خلاقانہ، فنکارانہ اور ساحرانہ جلال و جمال اور کمال کا دِل فریب مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن ان کا سب سے مضبوط حوالہ یا دِل پسند ترجیحات آزاد نظم اور صنفِ غزل ہی ہیں۔ میرے پیش نظر ان کی بہت سی آزاد نظمیں ہیں۔ ماقبل اس سے کہ میں ان کی نظموں پر گفتگو کا آغاز کروں آزاد نظم کہ حوالے سے اس کے مبادیات و مضمرات پر بھی چند جملے رقم کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

بلینک وَرس یا آزاد شاعری ہمارے یہاں مغرب سے مستعار لی گئی ہے۔ ردائف و قوافی سے معریٰ و مبریٰ اس انداز کی شاعری کو ترقی پسند دور میں فروغ حاصل ہوا۔ دراصل اُس وقت کے شعراء کا اہم مسئلہ ملک کو غلامی کے طوق و سلاسل سے رہا کرانا تھا اور طبقاتی کشاکش کو دور کرنے کے لئے ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جو قوافی کی محتاج نہ ہو، سہل ہو، اور جس کے وسیلے سے مافی الضمیر کو بہ

آسانی بیان کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کی اشاریت اور پابند نظم کی عروضی دِقت سے عاجز ہو کر انہوں نے آزاد نظم کو اپنا آلہ بنایا۔ اس ضمن میں سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، اختر الایمان، جاں نثار اختر اور مخدوم محی الدین کے نام گنوا دینا کافی ہوگا۔ ملک آزاد ہو جانے پر جب رفتہ رفتہ ترقی پسندیت کا سورج غروب ہو گیا تو جدیدیت کا جنم ہوا۔ جدیدیت اگر چہ ترقی پسندی کی تحریف تھی لیکن آزاد نظم سے اُسے کوئی بیر نہ تھا بلکہ یہ کہنا مزید درست ہوگا کہ جدیدیت پسندوں نے آزاد نظم کو اور بھی بلندی پر پہنچا دیا۔ ان میں جنیوئن شعراء کے علاوہ زیادہ تر ایسے شعراء بھی تھے جنہوں نے لفظی بھرمار، نامانوس الفاظ اور ناقابل تسخیر علامتوں کی دراندازی سے آزاد شاعری کو مجذوب بنا کر رکھ دیا تھا اور جس طرح ترقی پسند شاعری نعرے بازی کا شکار ہوئی اسی طرح جدید شاعری بھی عدمِ ابلاغ کی نذر ہو گئی۔ بعد میں کچھ شعراء نے اپنی اصلاح کر لی اور کچھ شعراء آج کے مابعد جدید دور میں بھی پہلے کی طرح متضاد الفاظ اور بے معنی علامتوں سے شاعری کو معجون مرکب بنا کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ان کی نظمیں کوئی پڑھے نہ پڑھے، کسی کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں اس سے انہیں کوئی غرض نہیں۔

ایسے شعراء کے برعکس کچھ شعراء ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن کی آزاد اور نثری نظموں میں خیال کے تسلسل کے ساتھ گہری

معنویت بھی پائی جاتی ہے اور وہ نا قابل فہم بھی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر درخشاں اندرابی بھی نظم کی ایک ایسی ہی شاعرہ ہیں جو درونِ ذات اور کائنات پر مبنی اپنے تجربات و مشاہدات اور نازک ترین احساسات کو علامات واستعارات کی زبان میں کچھ ایسے دلکش اور موثر اسلوب میں بیان کرتی ہیں کہ ان کی جدت و ندرت کا طلسم کدہَ حیرت دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ وہ اظہارِ بیان کے طور پر جو الفاظ اور استعارات انتخاب کرتی ہیں وہ ان کے موضوع اور خیال کی معنویت کے ترسیل و ابلاغ کی راہ میں رخنہ انداز نہیں ہوتے ہیں اور شاعرہ کے اندرون میں ہلچل پیدا کرنے والے متلاطم جذبات واحساسات قارئین کے دلوں میں خود بخود منتقل ہو کر انہیں اپنے شکنجے میں کس لیتے ہیں۔ الفاظ کی گرفت میں نہ آنے والے احساسات کو تخلیق کے سانچے میں وہی ڈھال سکتا ہے، جسے الفاظ سے من چاہے مفاہیم بر آمد کرنے کا ہنر آتا ہو اور جسے اپنے فن پر عبور حاصل ہو۔ ڈاکٹر درخشاں اندرابی ایک ایسی ماہرِ فن شاعرہ ہیں جنہوں نے درجنوں معرکتہ الآرا اور شاہکار نظمیں تخلیق کر کے اپنے آفریدگارانہ وسخنورانہ اور خلاقانہ وساحرانہ جمال وکمال کے دریا بہا دیے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے یہاں ان کی شاندار نظم ''رتجگا'' کا حوالہ ہی کافی ہوگا۔ یہ نظم گزری ہوئی جاں افروز اور حیات بخش ساعتوں کی بازیافت کے تفاعل سے منسوب ہے کہ رات اور تنہائی میں شب بیداری، ماضی

کے اُجلے نقوش کی درخشانی و تابناکی سے حزن و یاس کی سیاہی کو اس کے منفی تاثرات سے محروم کر کے اپنی دلجمعی و خوشی کے بہانے تلاش کر ہی لیتی ہے۔ نظم کی اختتامیہ سطریں بذات خود موضوع کا خلاصہ ہیں ملاحظہ فرمائیے

میں رات کے تہہ خانے میں
گُپ چُپ
اُجالے کے آبشار کے نیچے
نہا رہی ہوں

معروف فلمی گلوکارہ سُدھا ملہوترا جس نے فلموں میں ساحر کی نظموں کو اپنی آواز بھی دی تھی، ساحر کا اس سے عشق نہ جانے کب ایسے موڑ پر پہنچ گیا کہ انہیں کہنا ہی پڑا

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دلنوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے
نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کا راز نظروں سے
محبت روگ بن جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن

اُسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑ نا اچھا
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

درخشاں اندرابی نے بھی اسی رنگ و آہنگ میں ڈھلی نظم ''جدائی'' کو اپنے منفرد اسلوب میں بخوبی پیش کیا ہے۔ مُتفرق و متضاد آوازوں کے باہم تصادم کے نتیجے میں دو فریقوں کے مابین وسیع ہوتی دوری کی کھائی اور کسی کے صبر کی متنازعہ فیہ کیفیت کا حسین شعری اُسلوب ملاحظہ ہو ؎

''طرح طرح کی آوازوں کے تصادم میں
موسیقی کے تار ایسے بج رہے ہیں
جیسے میں تمہاری خوشحالی میں
فِقر کی طرح بج رہی ہوں''

ایسے ناگفتہ باحالات میں جبکہ ایک چھت کے نیچے ایک ساتھ رہنا جہنمی عذاب جھیلنے کے مترادف ہو جائے تو علاحدگی یا ترکِ تعلق سے بہتر راستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اس موقع پر شاعرہ کا یہ مشورہ فطری اور درست ہی معلوم ہوتا ہے کہ ؎

''آؤ ایک تیسرے راستے پر کچھ قدم ساتھ چلیں
تم مشرق کی جانب چند قدم نکلو
میں مغرب کی جانب چند قدم جاؤں''

اور اس طرح مخالف سمتوں میں قدم بہ قدم آگے بڑھتے

ہوئے فاصلہ ناقابل عبور ہوجائے تو سارے مسئلے خود بخود حل ہوجائیں گے۔ تعلق کے سارے بندھن ٹوٹ جانے پر جو بیگانہ وشی جنم لے گی وہی اس مشکل کا حقیقی حل ہوگی۔ پھر اس کے بعد اتفاقاً وہ کبھی سرِ راہ ملے بھی تو اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب سے ہوکر کچھ اس طرح گزر جائیں گے۔

''پھر اگر ہم لوٹ بھی آئیں

تو پھر بآسانی ایک دوسرے کے پاس سے نکل سکتے ہیں

اپنی اپنی سمتوں کی اور''

رشتے باہمی عزت، قدر و منزلت، مفاہمت اور حقیقی مہر و محبت کے جذبے سے اُستوار ہوتے ہیں۔ جن رشتوں میں یہ خوبیاں ہوتی ہیں وہی سالم رشتے کہلانے کا استحقاق رکھتے ہیں وگرنہ ایک جگہ ایک ساتھ رہنا دشوار ہوجاتا ہے۔ محبت کے جذبات اور باہم مفاہمت کے بغیر حاصل ہوئی قربت کیا ہوتی ہے ایسی قربتوں کا انجام کیا ہوتا ہے شاعرہ کو اس کا گہرا تجربہ ہے جو اُن کی نظم ''سالم رشتہ'' سے آشکار ہے۔ باہمی رشتے میں خودسپردگی اور دُکھ سکھ میں شرکت کے فقدان کی آئینہ داران کی نظم کے یہ بامعنی مصاریع جو اس نظم کا اختتام بھی ہیں ملاحظہ ہوں۔

''میں آئی تو آئینہ لے کر آئی

تم آئے تو ہاتھوں میں پتھر لئے

آئینے کا بُت توڑا

اور ساتھ ہی بت پرستی کا امکان بھی

ہم نے اپنے رشتے میں کچھ بھی نہیں بانٹا

ایک دوسرے کو بھی نہیں''

آدھے ادھورے نیم مردہ کاغذ کے پھول جیسے صرف نام کے مصنوعی بجھے چراغ سے رشتوں کے خلاف شاعرہ کی بیشتر نظمیں زبردست احتجاج کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہیں۔ اُن کی نظم ''پہاڑیاں کھود ڈالیں'' بھی اسی قبیل کی نظم ہے جو رشتوں کی بے چراغ و بوسیدہ زنداں نما پہاڑیوں کو منہدم کر کے رہائی کی کھلی فضا میں سانس لینے کی تلقین کرتی ہے۔ وجود و ذات کے تحفظ کی علمبردار اس نظم میں رمز و اشاریت، شعریت اور تہہ دار معنویت کے جوبن کا نکھار اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ اس نظم سے مستعار ذیل کا اقتباس بذاتِ خود کھوکھلے رِشتوں کے خلاف شدید احتجاج کا مظہر ہے۔

''یہ ساری پہاڑیاں کھود ڈالنی ہیں

مُردار خور رشتے داری کی

رسیوں کی گانٹھیں کھول کر

خیموں کو گرا دینا ہے

اور ڈھک لینا ہے

باہوں میں بھر کر قید کرنے کا ہیبت ناک ارادہ''

''کربلا'' کے عنوان سے بھی انہوں نے تین مختصر نظمیں تخلیق

کی ہیں جو ایک ایسے رنگ کی عظمت و حُرمَت کو منکشف کرتی ہے جو حق وصداقت کا رنگ ہے اور سارے رنگ اس رنگ کے آگے ہیچ ہیں۔ ان کی ان نظموں میں سے اس رنگ و آہنگ کی ایک نظم ذیل میں منقول ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ؂

''شمشیر ہے سجدہ گاہ
صلوٰۃ کے معنی سر
جب آگ ہو سینے میں
تو سرخ ہی ہونگے پَر''

ڈاکٹر درخشاں اندرابی کثیر الجہات موضوعات کی شاعرہ ہیں۔ اس مجمل مضمون میں ان کی سبھی نظموں کا ذکر ممکن نہیں اس لئے اتنے پر ہی مکتفی ہوتا ہوں۔ مجھے یقین ہے اُن کا مستقبل تابناک ہوگا۔

رئیس الدین رئیسؔ

علی گڈھ

با معنیٰ نظموں کی سوغات

درخشاں اندرابی کی نظموں میں اردو شاعری کی پرانی روایتوں سے برآت کے اظہار کا جو شائبہ محسوس ہوتا ہے اس کی نوعیت تخلیقی نہیں بلکہ سماجی ہے۔ سماجی اس طرح کہ ان کی نظموں میں ذات کے حوالے سے (ذات کے علاقے میں) اور کہیں غیر مادی عناصر (روزۂ سکوت اور رت جگا) کی شکل میں سماج سے متعلق دِلاویز جذبات وخیالات ظاہر ہوتے ہیں، ان کا مرکز سماج نہیں بلکہ خود ان کی اپنی ذات ہے جس کے آئینے میں وہ سماج کے رخوں کو دیکھتی ہیں، اپنی نظموں کے معیاروں کے تعین کے سلسلے میں انہوں نے اظہار کے تجربوں کی تقویم وتفہیم پر خاصا زور دیا ہے۔ ان کی ایک نظم ''ذات کے علاقے میں'' میں اس کا اثر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

''میری ذات کے علاقے میں
لمحوں کو گھڑی کی بیڑیاں نہیں باندھیں
کل آج اور کل سے دور نہیں
کل آج اور کل کے پاس نہیں

درخشاں اندرابی سماجی ضرورتوں سے زیادہ روحانی ضرورتوں کو اپنی نظموں کا موضوع بناتی ہیں۔ ان موضوعات کو تخلیقی جامہ پہنانے کے لئے وہ تخلیقی عمل کی پیچیدگیوں کو کام میں لاتی ہیں، اس لئے ان کے یہاں علاماتی اور استعاراتی مطالبات غور وخوض کا تقاضا کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں سوچے ہوئے خیالات کو نظم کرنے کے سلسلے میں لفظوں کے انتخاب کی اپنی دنیا رکھتی ہیں جو مبالغے سے پاک اور اصلیت کے ایک نہیں کئی تصورات کو اپنے دائرہ اثر میں رکھتی ہیں۔ وہ شعری جمالیات کے کسی نئے تصور سے زیادہ تہذیب وترقی کے ان تصورات سے علاقہ رکھتی ہیں جو ادب کی افادیت اور اس کے سماجی رول کے آئینے میں روحانی تسکین کے ذرائع فراہم کرتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''پہاڑیاں کھود ڈالیں'' کی ابتدا یوں ہوتی ہے......

''آؤ یہ ساری پہاڑیاں کھود ڈالیں
ان پہاڑوں کے غاروں میں جلتے چراغ
کب کے بجھ گئے ہیں
اندھیروں کو سمجھائے رکھنا فریب ہے...........

پہاڑیاں کھودنے کے بعد
اپنی رفعتوں پر چڑھ کر
خودکو دیکھنے کا مزہ ہی اور ہے

ظاہر ہے کہ معینہ مقاصد کے علاوہ بھی امکانات کی کئی راہیں وا ہیں۔

درخشاں کی بعض نظموں میں گہری جذباتی کشمکش کے نشانات ملتے ہیں (بہت سی روئی دھنک چکی ہے، احساس، جل رہی ہوں) ۔وہ ان کے عملی مسائل کے تناظر میں ایک آلہ کار کے طور پر برتنے کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ اُن کی ایک نظم "کرم پیلہ" جہاں المناک واقعات کے ایک تسلسل کی جانب اشارہ کرتی ہے وہیں اس کے آگے تخلیقی لمحات میں زمان و مکاں کی حدود سے آگے مادی رشتوں کی عریانیت کی توجہ گر بھی بن جاتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو ...... ۔

"کرم پیلہ ہوں
کہ خود کفن خود ی تند
تار تار ہتھکڑی میں
زیوروں سے سج گئی
اپنی گنگناہٹوں میں
تار تار بج گئی
اپنی ہی طلب میں خود کو
باندھ کر میں بندھ گئی
ریشمی خرقے میں میری
سانسیں ہوگئی ہیں بند

کرم پیلہ ہوں

کہ خود کفن خودی تند''

درخشاں اندرابی کے تخلیقی التفراق میں منطقی اثبات پسندی کے جمالیاتی انسلاک کا وہ لسانی اظہار نہیں ہے جو تخلیقی ہیت کے اعتبار سے لفظ کی بنیادی صداقت پر اسرار کرے کیوں کہ اس طرح نظم کی زبان خیالات تک رسائی کا وسیلہ نہیں بن سکتی اور محض ایک مبہم اشارے تک محدود رہ جاتی ہے۔ ان کا تخلیقی وِژن زبان کے میکانکی تصور سے زیادہ تخلیقی تصور کا قائل ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک زبان خیالات کی قاصد ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے آگے ارفع و اعلیٰ مقام کی حامل ہے۔

زبان کا تخلیقی استعمال جہاں فکری روایت اور لسانی روایت کے ناگزیر تعلق کو نمایاں کرتا ہے، وہیں تخلیق کار کی فطرت شعاری سے ہم آہنگی کے لئے بھی راہیں ہموار کرنا ہے۔ درخشاں اندرابی کی ایک نظم ''بہت سی روئی دُھنک چکی ہے'' زبان کی فکری اور لسانی دونوں روایتوں کی عمدہ مثال ہے جو ذیل میں درج ہے ۔

''بہت سی رُوئی دُھنک چکی ہے

بہت سا گردہ جمع ہُوا ہے

حلاج یادیں دفن ہوئی ہیں''

درخشاں اندرابی کے یہاں ایسی نظمیں وافر تعداد میں ملتی ہیں: (تھوریو کے لئے ایک نظم، نقاد، توڑ دیں آئینے، کتنی عجیب بات، عشق کی راہ، دستک، ہوشیار خبردار، عجب سی صورت ہے کشف کی یہ، اشتہاروں والی عورت، جدائی، برہنگی، سالم رشتہ، مکالمے سے رشتہ وغیرہ) جو ان کے مختلف تصورات اور اس کے برتنے کے اسلوب کی ضمن میں حیرت انگیز مسرت سے دوچار کرتی ہیں۔ اردو کے اس دور میں جہاں پیچیدگی کے نام پر نثری عبارت کو دو تین ٹکڑوں میں لکھ کر نظم بنا دینے کا رجحان بھی موجود ہے، درخشاں اندرابی کی یہ بامعنی نظمیں اردو ادب میں ان کے روشن مستقبل کی بشارت دیتی ہیں۔

جاوید انور
مُدیر تحریکِ ادب
وارانسی

امام عالی مقامؑ کے لئے ایک نظم

صحرا نے بانجھ کوکھ میں
بوند بوند اُتاری لالی
کرن کرن سورج نے
آغوش میں لیا سب کُچھ
بنجر میں کِھلی کلیاں
یہ اندر کی تھی صورت
اور باہر
رات اپنی غاروں گپھاؤں میں
بھر رہی تھی ماتمی چیخیں
سمندر

یہ جو ٹھاٹھیں مار کر
خاموشیوں کو اپنے سینے میں چھپاتا ہے
قطب تا قطب بے سرحد
لہر در لہر چلتا ہے
اُسی اِک کوکھ کے بسنے کا وہ اعلان کرتا ہے
وہی اعلان بنجر میں برف سوغات لاتا ہے
وہی اعلان سوکھے کھیت میں بوچھار کرتا ہے
وہی اعلان مشرق اور مغرب کو مِلاتا ہے
وہی اعلان پھر ارض و سما میں پھیل جاتا ہے
نہ ہی پہچان کی کوئی بھی پھر تفریق بچتی ہے

اذانِ خیر کے دھاگے میں
بندھ جاتا ہے ہر کوئی
بڑا سورج ہر اِک شے کو
بخش دیتا ہے اپنے رنگ
یہ سارے رنگ اعلیٰ ہیں



رَت جگا

اندھیرے کی پلکوں نے
آنکھوں سے
ساری تھکان جھاڑ دی
اور اضطِراب ِکرن ِکرن کاڑھتا رہا
جاگتی آنکھوں کی ملائم سفید چادر میں
رنگ ِبر نگے نقش
پوری رات
اِن ہی نقوش کی تعریف میں گذری
پوری رات
رات کا دامن خالی ہوتا گیا

پوری رات

میں بھِک منگے کی طرح پڑی رہی
آنکھوں کی چوکھٹ پر

رَت جگا
میری جلتی نِندِ یائی آنکھوں پر
اوس کی بوندوں کی طرح گِرا
رَگ جگا
میری صبح کی تسبیح پر
پھیرتا رہا تہجُد کی تھکان
رت جگا
میری کاہل کایا کو
اُجالے کے خلاف اکساتا رہا

میں رات کے تہہ خانے میں
گُپ چُپ
اُجالے کے آبشار کے نیچے
نہارہی ہوں



روزۂ سکوت

بیابانوں کی زمینوں سے
تیری سرگوشی نے زینہ زینہ
کردیا بالا مجھے
میں نیلی چھتریوں کے بے سمت بیابانوں میں
خیمہ زن ہوتے ہوئے
بوتی رہی ترکِ تعلق کے کھیتوں میں
تعلق داری کے بیج
اور کاٹتی رہی یاس سے پھوٹے آنند کی فَصل
وہی زادِ راہ لے کر
خلاؤں میں ہمکلامی کے سفر پر چلی

وہاں مکتب میں گھونگا پن زباں تھی

وہاں مکتب میں بہرا پن سماعت

وہاں سبقِ اول روزۂ چُپی

وہاں سبقِ دوم روزۂ چُپی

وہاں سبق سوم روزۂ چُپی

وہاں احکامِ مرشد بس خموشی

وہاں بیعت خموشی، عہد چُپی

موسِ کل گوش کے نقارۂ سکوت کی دُھن
کھینچتی گئی مجھکو میرے وجود کے ہنگاموں سے باہر
اور میں پھر کینچلی اتار نکل آئی
روزۂ سکوت کی طرح
پاک وعیاں



جُدائی

طرح طرح کی آوازوں کے تصادُم میں
موسیقی کے تار ایسے بج رہے ہیں
جیسے میں تمہاری خوشحالی میں
فِقر کی طرح بج رہی ہوں

تم اپنے لہجے کے اعتماد سے آزاد
اور میں اپنے آپ کی گِرفت سے آزاد

آؤ ایک تیسرے راستے پر کچھ قدم ساتھ چلیں
تم مشرق کی جانب چند قدم نکلو
میں مغرب کی جانب چند قدم جاؤں
تم اپنے وجود میں دھنسے اس تیر کے ٹکڑے کو
باہر نکال کر پھینک دو
جو وہاں چبھ رہا ہے برسوں سے
اور میں برسوں سے پوٹلی میں بند
سنگھنی کو سونگھ لوں
تاکہ سانس لینے کا نشہ محسوس ہو
پھر اگر ہم لوٹ بھی آئیں
تو بہ آسانی ایک دوسرے کے پاس سے نکل سکیں
اپنی اپنی سمتوں کی اور



برھنگی

میں اپنی تخلیقات کی چھت پر
اُتار رہی ہوں
اپنی تہہ در تہہ جمع شُدہ کینچُلیاں
اور اپنی دید کے سامنے
ہو رہی ہوں بے پردہ
برہنہ سر تاپا
میری تخلیقات کی بے ترتیب سانسوں میں
ٹھہراؤ کا پڑاو خیمہ گاڑتا ہے

میں اسی خیمے میں سستانے بیٹھ جاتی ہوں
مجھ جیسی کچھ کاوشیں
میرے سر کے اوپر
میرا آسمان بن جاتی ہیں
جس پر کچھ لفظوں کے تارے ٹمٹماتے ہیں
جو ایسی تخلیقات کے امکانات کی گواہی دیتے ہیں
جن کی چھت پر
آسمان کے خیمے میں
سُستاتے بیٹھے تخلیق کار کی سوچوں میں
میں ہوں

برہنگی ہمارا رشتہ ہے



سالِم رشتہ

ہم نے اپنے رشتے میں
کچھ نہیں بانٹا
ہم ساتھ تو رہے
لیکن کسی مقصد کی بیڑیوں سے آزاد

تم آئے تو ڈھیر سارا کوڑا بکھیرا
میں آئی تو جھاڑو لے کر آئی

کوڑا اٹھایا
اور ساتھ کے احساس کا بوجھ بھی

میں آئی تو آئینہ لیکر آئی
تم آئے تو ہاتھوں میں پتھر لئے
آئینے کا بُت توڑا
اور ساتھ ہی بت پرستی کا امکان بھی
ہم نے اپنے رشتے میں کچھ نہیں بانٹا
ایک دوسرے کو بھی نہیں



مکالمے کا رشتہ

ہنگاموں کے اجلاس برخواست ہوئے
مکالمے کی سیڑھیاں چڑھکر
میں تمہارے من تک آئی
تمہارا من ایک پراسرار جنگل ہے
جس میں ہرا اور دوڑتی ہیں
بے شمار پگڈنڈِیاں

ان پگڈنڈیوں پر مکالمے کا سفر
جیسے قدم بوس ہے
وہ میرے من کی شاہراؤں پر
مَحوِ سفر ہے

آؤ طواف کریں
ایک دوسرے کا
اور دیکھیں کہ مکالمے کا رشتہ
سُنسان پگڈنڈیوں اور مشغول شاہراؤں سے
سفر کر کے کہاں پہنچتا ہے
تم تک یا مجھ تک



پہاڑیاں کھود ڈالیں

آؤ یہ ساری پہاڑیاں کھود ڈالیں
ان پہاڑوں کے غاروں میں جلتے چراغ
کب کے بجھ گئے ہیں
اندھیروں کو سمجھائے رکھنا فریب ہے
فریب کی گھپاؤں سے بہتان کی دھول نکل رہی ہے
اور ڈھک رہی ہے ہماری آزادی کی چاہ کا وجود

آدھے ادھورے رشتوں کے
نیم مردہ وجودوں کو روندھ کر چلنا ضروری ہے
یہ رشتے ہمیں خود سے چھُپائے ہوئے ہیں
ہمیں خود کو تلاشنا ہے
یہ ساری پہاڑیاں کھود ڈالنی ہیں
مردار خور رشتے داری کی
رسیّوں کی گانٹھیں کھول کر
خیموں کو گرا دینا ہے
اور ڈھک لینا ہے
بانہوں میں بھر کر قید کرنے کا ہیبت ناک ارادہ

پہاڑیاں کھودنے کے بعد
اپنی اونچائیوں پر چڑھ کر
خود کو دیکھنے کا مزہ ہی اور ہے



صلوٰۃ ذات

کچھ کرنوں کی بارش ہوئی
اور دھول نے ڈھک لی رات
خدشۂ جسم و جاں فنا فنا
ٹھہر! ٹھہر! میری بات سن
میری بات مکتوبِ عروجِ وقت ہے
ایسی مہکتی ہوئی سیج
جس پر دو مضطرب روحیں
بے قرار ہیں اپنی برہنگی بانٹنے کے لئے
سطر سطر پڑھ

اور مہک کے آبشار کے نیچے نہا
اس متبرک اشنان کے بعد
اپنے آئینے کے ساتھ دان کر
اپنی تمام پرانی تصویریں
یہ صلوٰۃِ ذات کی سب سے مُتبرک گھڑی ہے

جھک جا اور سجدہ رقصِ خموشی میں
آیاتِ سرمستی ادا کر
دیکھ! روشنی اور تاریکی کی مملکتوں کے بیچ
ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں
جاتی ہوئی بھری بھری کشتیاں
ان میں ہمارے زمانے کے کچرے کے ساتھ ساتھ
ہم بھی بھرے ہوئے ہیں
یہ کشتیاں
اُس لمحے کے جزیرے پر خالی ہونگی
جہاں دعاؤں کی قبولیت کی رات
دن کے ٹیلے پر محوِ قرار ہے



نظم کی چھت پر

نظم کی چھت تک
جانے والی سیرھی کے
ہر پائیدان پر
ادراک کے قدموں تلے
روندھے جا رہے ہیں
ضابطوں کے امین صحیفے
ایک کلی سے مانگ کر
کچھ کچّے رنگ
ان قدموں میں بج رہے ہیں
پازیب کی طرح
صحیفوں کے حوالوں کی چھٹپٹاہٹ

حرکت میں تبدیل ہونے سے رہ جاتی ہے
رنگوں کی پختگی کے اندیشے
ہو جاتے ہیں بے صدا
نظم کی چھت تک جانے والی سیڑھی
پائیدانوں کی گنتی کی زمین سے ہٹ جاتی ہے
اور پیمائش جہاں ہوا ہوتی ہے
وہاں ٹکتی ہے
اپنی زمین سے اڑان بھرتے ہوئے لفظ
دھواں دھواں چھاؤں میں رقصاں
پائیدان پائیدان کرتے ہیں سفر
نظم کی چھت پر
شبِ تہجد
کرن کرن روشنی اُجالا
خیالِ آتش کھِلا ہے لالہ
نظم کی چھت پر



وصل

پھولوں بھری سیج پر
وہ دونوں بے لباس
بیچ میں رکھی ہوئی
ننگی تلوار تیز دھار

وصل میں جاں لٹانے کی خواہش
اوڑھا رہی ہے
سیج کو پسینے کی چادر



آؤ کس لیں کجاوَہ

آؤ کس لیں کجاوَہ
اور سو جائیں
آؤ بستر بچھا دیں
اور نکل پڑیں سفر پر

صورتیں جب دُھواں دُھواں ہوں
تو بہار جو بن پر ہوتی ہے
موسموں کی اُڑان کی سرمستی

خزاں کے رنگ بکھیرتی ہے
آؤ باراں میں سوکھ لیں
اپنے جسم سے صحرا
اونٹ کے بڑھتے ہوئے قدموں تلے
چھپا لیں سمندر کے راز

ماں کے بوسے میں
دیکھ لیں معشوق کا تبسّمِ لمس
معشوق کی زلفوں سے
جھاڑ دیں اپنے دل پر جمی گرد

آؤ کس لیں کجاوہ
اور سو جائیں
آؤ بستر بچھا دیں
اور نکل پڑیں سفر پر



چھتریاں بند کردو

ذرا جشن منانے دو
ذرا بندھن وار لگانے دو
ناچ گانا ہونے دو
رہنے دو بے ہوش کچھ گھڑیاں
یہ عمل سالم ہونے کا عمل ہے
اس عمل سے گزرنے دو
میرے تخلیق کردہ میں کو
کہ میں نہ کسی کے اوپر بیٹھنا چاہتی ہوں

اور نہ کسی کے نیچے
بے ہوشی کی ریاضت کے ڈھول باجنے دو
اور اس لَے پر ہونے دو مُجھے قربان

ذرا جشن منانے دو
ذرا بندھن وار لگانے دو
ناچ گانا ہونے دو
نفع نقصان کے دکھ کو مسترد کر
بے پرواہ ہو جانے دو
سُکھ کی شیرینی کے ذائقے کا باراں
بھگو رہا ہے میرا پُورا وجود
اور میں اس بھیگن کی لذت کو منا رہی ہوں
اپنی چھتریاں بند کر دو



آیاتِ مُتشبِہات

ہر موسم میں
وہ بدل کر آتا تھا چوکھٹ
اور تالی بجاتے ہوئے
میری تنہائی کو جشن کے حوالے کر دیتا تھا
میں اسکے ساتھ
غار نشین ہو جاتی
اور اسے تسبیح تسبیح سانسوں میں پِروتی
انتظار کے ریگ زار میں
نمودار ہو جاتے کئی نخلستان
میں اندر باہر
مدتوں بعد کے غسل کا لطف لیتی

پھر آیا ایک موسم ایسا
کہ وہ چوکھٹ بدل کر آیا
اور تالی بجاتے ہوئے
میری تنہائی کو جشن کے حوالے کیا
میں اسکے ساتھ
غار نشین ہونے کے لئے گئی
تو غار کے منہ پر
مکڑے کے جالے کا پردہ دیکھ لرز گئی
یہ خیریت کا مقدمہ
میرے طواف کے زیاں کا پیغام تھا
میں واپس لوٹی
تو غیب کے موسموں کے حوالے ہو گئی
اب ریت سرک رہی تھی
اور گڑھے بن رہے تھے
میں ان گڑھوں میں اتر رہی تھی
دھیرے دھیرے
دھنس رہی تھی تمام تر وسوسوں کے ساتھ

درکتی ریت سے

سرکتی ریت سے

جنما ایک چشمہ

نکل آیا پانی

ریگ زار میں ڈُبکی لگنے ہی والی تھی میری

کہ وہ چشمے سے باغسل نکل آیا باہر

ہاتھوں میں نئے موسم کی نوید کی پرچی لئے

ہونٹوں پر چسپاں تھا میرا نام

نئے موسم کی دہری پر

اب آیاتِ مُتشبِہات کی تلاوت ہو رہی ہے

وہ میری صف میں

میرے ساتھ کھڑا ہے



سلسلۂ زنبور الاسوَد

سلسلۂ زنبور الاسود
ایک لے کی گیت مالا
چابیوں کا ایک گچھا
کھولتا ہے
خوشبوؤں کے
آسمانوں پر لگے
تالوں کو یکسر

سلسلۂ زنبور الاسود
اوس کی بوندوں کی مانند

گُل بدن میں آگ کے شعلے بساتا

غیب کے رُخِ نازنیں سے

پردہ ہٹاتا

بِھنبھناہٹ میں خموشی کو

کیئے دیتا سمندر



بہت سی رُوئی دُھنک چُکی ہے

بہت سی رُوئی دُھنک چُکی ہے
بہت سا گردہ جمع ہُوا ہے
حلاج یادیں دفن ہوئی ہیں

سنو اے عُریاں وجود والو
سِسک یہ تختۂ دار کی ہے
سنو کہ پونچھو
تہجدوں کی تسبیحوں سے

وظیفۂ حیرت

کئی دنوں سے
سفر بیانی منع ہے ٹھہری

بہت سی رُوئی دُھنک چکی ہے
بہت سا گردہ جمع ہُوا ہے
حلّاج یادیں دفن ہوئی ہیں
چُھپا کے البم
یہ آئینہ بھی
کھڑا ہے خالی



کِرم پیلہ

کِرم پیلہ ہوں
کہ خود کفن خود ی تند

تار تار ہتھکڑی میں
زیوروں سے سج گئی
اپنی گنگناہٹوں میں
تار تار بج گئی

اپنی ہی طلب میں خود کو
باندھ کر میں بندھ گئی

ریشمی خرقے میں میری
سانسیں ہو گئی ہیں بند
کرم پیلہ ہوں
کہ خود کفن خودی تند



احساس

آنکھ سورج سے دُھواں پھوٹ پڑا
ہر نظارے کے رُخ پہ پُتتی رہی
دید کے نور کی سیاہ چادر
بُوند بُوند کہکشانیں جذب ہوئیں
گردشِ کائینات کے دوراں
ہر صدا یوں بیان سے ٹوٹی
ایک احساس نے اعلان کیا
مالک رواء ولا شاهد

ایک چھوٹے سے سیارے
زمیں سے
ایک من کے اندھیرے کمرے میں
اِک رِحل سے اٹھا ذرّی پردہ
اور چند بے صدا سے لفظ بجے
ایسے ٹکرائے
کہ چقمق سے جلا ایک دیا
نور کی زنجیر کی سبیل بنی
جس میں بندھ کر
ایک احساس نے
اپنی خوش منظری پر حمد پڑھا



تضاد

پھٹ گیا پستی کی گھٹن کا سینہ
اسطرح
کوہ کی گونج سے
اطراف و کنارے لرزے
مضطرب راستے پاتال کے
سمٹے کہ بچیں
کوہ کے خواب سمیٹے
چند کنکریاں
ایک جوگی نے کمنڈل میں
اُتارا یہ تضاد
اور اترا وہ بہت نیچے

نظر سے اوجھل
کوہ کی رفعتوں پہ دھیاں لگا

نا آشنائی کی ذد میں آ کے مرے
نکتہ سنجی کے نازک سوال و جواب
گورکن کے قدم ماپتے رہ گئے
اڑھائی گز آسماں کے سارے ثواب

ان تضادوں کے پنکھوں پہ
محوِ سفر
رنگ ہے
وحدتِ ذات کا
اس لئے
میں اڑانیں تضادوں کی بھرتی رہی
رنگِ وحدت میں خود کو رنگتی رہی



جل رہی ہوں

چمن کی یہ رِداپوشی
سماع کے ساز کے ذریعے
کِسی بھونرے کی دھن میں سج
اُترتی ہے نہاں خانوں کی عریانی میں
لحظہ لحظہ گُپ چپ
میری ویرانیوں میں رنگ ہائے گُل بِکھرتے ہیں
کسی کے آنے کی امید میں
درکھول دیتی ہوں

اور خود دہلیز پر دھر لیتی ہوں
چہرہ ہتھیلی پر
وہ بھونرا گیت گاتا
رقص کرتا
میری عریاں ڈالیوں پر
اور ردائے ساز میں پھر
اوڑھ لیتا مجھکو
ساری زندگانی کے لئے

میں اُنہیں یخ بستہ لمحوں کی زمیں پر
بیٹھ کر سوچتی ہوں آگ کے موسم کے گیت
جل رہی ہوں



ذات کے علاقے میں

میری ذات کے علاقے میں
لمحوں کو گھڑی کی بیڑیاں نہیں باندھتیں
کل آج اور کل سے دور نہیں
کل آج اور کل کے پاس نہیں
گھڑی میری ذات کے علاقے سے باہر
ٹنگی ہے کہیں کسی دیوار پر
اور بجا رہی ہے وقت

ڈھول پیٹ پیٹ
میں جس طرح نہیں محسوس کر پاتی
تمہیں تمہارے عشق کے باوجود
اُسی طرح گھنٹیوں کا شور بھی نہیں پہنچتا مجھ تک
ضرب ضرب بجنے کے باوجود

میری ذات کے علاقے میں
سمتوں کے بھرم لامحدود میں کھو گئے ہیں
اڑانیں مگر میرے پروں کے ساتھ جُڑی ہیں
اُڑانیں مجھ سے سفر کرواتی ہیں لگاتار
سِمتوں کے کھو جانے کے باوجود
تُم تک
اور پھر مجھ تک
ایسے میں ان دیکھا کُچھ نہیں رہتا
میری ذات کے علاقے میں



تھوریو کے لئے ایک نظم

امریکہ کے اس سنسان پتھریلے مقام پر
میرے موسموں کا کعبہ ہے
یہاں پت جڑ سبھی رتوں کی مملکتیں جیت کر
بنا چکا ہے اپنی راجدھانی
فتح کے گیت
فاتح کے جاہ و حشمت کے غمّاز
پتّھروں کے قلعوں کے پیچھے
جھینگر کی مدہوش کر دینے والی لَے کے حوالے بنے
تھوریو پت جڑ کے اس جشن کا مہمانِ خصوصی
میں نے اس گیت کی سرزمین میں
بہار کے کئی بیج بو دیئے

جھینگر پسِ پردہ

تحمل کی لے کی عہد و پیمانی واضح کر رہے
میرے بیجوں سے کونپلیں پھوٹیں
اور پھر پھول کھِلے
یہ موسموں کی رفتار
تھوریو کے قدموں کی بے حرکتی کے نیچے
دبی رہی
جھینگر تبھی بے پرواہ
استقلال کے سُر لگا لگا کر
پت جڑ کی سرداری کا کر رہے اعلان
اور میں اس روحانی سفر کے پڑاو
طے کرتی رہی
اسی لے کی رہبری میں

تھوریو زمانی وابستگیوں سے الگ
پت جڑ کے جشن کو بخش رہا دوام



توڑ دیں آئینے

آؤ توڑ دیں آئینے
اور اپنی شکل کی قید میں بند
انا کو آزاد کر دیں
آؤ توڑ دیں آئینے
اور آس پاس کے عکس میں
دیکھ پائیں اپنا نہ ہونا
آؤ توڑ دیں آئینے
تا کہ بر عکس کے آسیب سے
چُھڑا پائیں خود کو

آؤ توڑ دیں آئینے

اور اپنی شکل کے ساتھ کر دیں وابستہ

اوروں کی شکلیں

اور پھر خود سے ملنے کے لئے

اوروں کے چہرے میں ڈھونڈیں

اپنے جیسا کچھ

کانچ کی ٹوٹن کے آسیب سے

بچنے کی صورتیں

بھٹک رہی ہیں

ہماری تنہائی کی وحشت میں

اِدھر اُدھر

بے لگام خواہشوں کی طرح

آئینے توڑ کر

خود کو وہاں ڈھونڈیں

جہاں ہم کبھی گئے ہی نہیں



چلو سو جائیں

چلو سو جاتے ہیں
اور نیند کی جاگ کے دیس
سُنتے ہیں ہوشیاری کے گونجتے نغمے
اِن نغموں کے بہانے
منائیں تہوار
اُن پُرانی رُتوں کے
جنکے بارے میں
بچوں کو بتاتے ہوئے
ہم لاچار سے ہو جاتے ہیں
اور لوٹ آتے ہیں
گونگے پن کی دہلیز تک

چلو سو جاتے ہیں
اور پونچھ لیتے ہیں
اپنے اوپر لگے اِلزام کی کالِکھ
کہ ہم خواب بننے کی عمر سے
گذر چکے ہیں
بُن کر خوابوں کا رنگین دُشالہ
اوڑھ لیں اُسے
تا کہ دوسروں کو ہم بے رنگ نہ دکھیں

چلو سو جائیں
اور بیداری کے سراب سے نکل کر
زندگی کے ریگ زار میں
پا لیں ایک نخلستان
جہاں ایک چھاؤں میں سُستا لیں
اور سو جائیں بے فکر



کتنی عجیب بات

تم سے ہے رسم وراہ نہ ترکِ تعلقات
کتنی عجیب بات
جیسے کہ میرے شہر کے شورِش زدہ حالات
کتنی عجیب بات
پرچم پہ جو چسپاں کئے بیڈروم کے جذبات
کتنی عجیب بات

لاشوں کے سینے ٹھوکتی ہمکارئی بارات

کتنی عجیب بات

کربل ہوا ہے پھر بھی رواں کس طرح فرآت

کتنی عجیب بات

فتح کے جشن میں ہے امیرِ شکست مات

کتنی عجیب بات

کتنی عجیب بات کہ ہم ضابطوں کے ڈال

کتنی عجیب بات کہ ہم ضابطوں کے پات

کتنی عجیب بات



عِشق کی راہ

برف ترنگیں دیکھی ہیں کیا؟
دھوپ کے گالے محسوسے ہیں؟

جب یہ دیکھو
جب محسوسو
تب سمجھو گے
عشق کی راہ پر چلنا کیا ہے



دستک

دروازے پر کسی نے دستک دی
میں دروازہ کھولنے سے پہلے
سینے پر پھیر لیتی ہوں اپنا ہاتھ
پھر دروازہ کھولتی ہوں
ڈاکیہ مکان مالک کا کرائے کا بل
تھما دیتا ہے
میں اُسے نہیں کھولتی

کھولتی ہوں بند آنکھوں کے اندر
اپنے بچپن کے گھر کے کواڑ
اور دوڑتی ہوئی چڑھ جاتی ہوں
اوپر اپنے کمرے تک جاتی
اونچی گھماؤ دار سیڑھی کے زینے
اور کچھ دیر اپنی مملکت میں
راج پاٹھ کے بعد اتر آتی ہوں واپس
سیڑھیاں اترتے گر جاتی ہوں
اور روتے ہوئے پکارتی ہوں: ''اُئی ماں''
آنکھ کھل جاتی ہے
اور اپنے گھر کی طرح
ماں کا بھی کہیں کوئی اتہ پتہ نہیں
آنکھوں سے چھلک آئی نمی سے ہی
پونچھتی ہوں چہرہ
دروازے پر پھر دستک ہوتی ہے

میں دروازہ کھولنے سے پہلے
سینے پر پھیر لیتی ہوں اپنا ہاتھ
پھر دروازہ کھولتی ہوں
تیز ہوا کے جھونکے
مُجھ سے ٹکراتے ہوئے اندر گھُستے ہیں
اور اندر بکھیر دیتے ہیں
چاروں طرف
اپنے ساتھ لایا ہوا گردہ
میں اپنی آنکھیں مینچتی
گردے کی طرح بکھر جاتی ہوں
پورے گھر میں
ہر چیز پر اٹ جاتی ہوں
بچپن کی طرح



ہوشیار، خبردار!

ایک پُکار
قدموں کی چاپ اور لاٹھیوں کی ٹھک ٹھک کے ساتھ
اندھیرے کی گلیوں سے سمٹ کر آئی
اور عجائب گھر کے ایک محفوظ فریم میں
پناہ پا گئی
میری تاریخ جس طرح بُتوں اور سکّوں کی زنگ میں
دم توڑ رہی ہے

میرے اجداد کی چہل قدمی اور جد و جہد بھی
اُسی طرح محافظ خانوں میں پتّھر ہوگئی ہے
اب جب کوئی بھولا بھٹکا
کبھی کباڑ کو کھنگالنے کی سنک اتارنے نکلتا ہے
میرے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے
''ہوشیار! خبردار!!''
یہ بلند آواز والا انتباہ سُن کر
میرے بچّے مُجھ پر خوب ہنستے ہیں
اور انکے ٹھہاکوں سے میں سہم سی جاتی ہوں
اور اپنی ہی اس چیخ کے عجائب گھر میں
ایک محفوظ فریم میں پناہ لے لیتی ہوں
ڈری سہمی



عجب سی صورت ہے کشف کی یہ

یہ میرا بھیجا پگل گیا ہے
تمہاری آنکھوں میں زخم رِستے
یہ آنسوؤں کی لڑی ہے یا کہ
حرارتِ ذِکرِ تُم کی
گھسی ہوئی
تسبیح کے دانے
میرے ہی ہاتھوں نکل گئے ہیں
عجب سی صورت ہے کشف کی یہ

تمہارے ظاہر میں غیب میرا
شہادتوں کی طرح عیاں ہے
میرے ہی سجدوں کی نیتوں میں
تمہارے ارکانِ رسم ورہ ہیں
عجب سی صورت ہے کشف کی یہ

تم اپنی آنکھوں کے بحرِ غم میں
میری خوشی کے دیئے جلاؤ
تمہاری راتوں میں روشنی کی سبیل بنکر
میں ماہ نوا پنے نَب سے اتروں گی
چاندنی کی وہ کھان لے کر
تمہاری تہہ تک کی ساری بوندیں
میں مانجھ لوں گی
عجب سی صورت ہے کشف کی یہ

تمہاری چھووَن کی لاج پی کر

میری طہارت ہوئی کہ

میرا قبول سجدہ

یہ دست گیری فنا کی حد سے

گذر کے دامن کو بھر رہی ہے

کشف کی صورت میرا مجھی سے

یہ کیسا تعارف کر رہی ہے

تمہاری جیسی ہی اک لطافت

یہ میرے اندر اتر رہی ہے۔



اشتہاروں والی عورت

چکّوں کی دوڑ جھیلتی ہے
اور خاموش گھلتے گھلتے
اپنی بڑھتی چکناہٹ پر اِتراتی ہے
اِشتہاروں والی عورت

پارلیمنٹ کے ہنگامے میں

قائیدوں کی چلاّہٹ کے بیچ
دبی سہمی آئین کی زبان ہے
اشتہاروں والی عورت

اخباروں کی سچّی خبروں میں
جھُوٹے رنگدار اعداد وشمار کے بیچ
قلم کی آزادی کا تعارف ہے
اِشتہاروں والی عورت

عورت کے حقوق کی آواز میں
اُبھر آئی مردانگی نے کہا کہ
آزادی کے پوسٹر پر چھپی ہے
اِشتہاروں والی عورت

خالی کمان کے اعتراضات پر

تیر کی چھٹپٹاہٹ کا وسیع و عریض حلقہ

نشانے کو کھا جاتا ہے تو بولتی ہے

اِشتہاروں والی عورت

اشتہاروں والی عورت

مُدراؤں اور مکالموں سے طلاق لیکر

مرتی ہے تو جنم لیتی ہے

اشتہاروں والی عورت



جلوس

کرفیوزدہ سنسان سڑک پر
پابندیوں کے بیچ
کہیں کوئی حرکت نہیں تھی
ایک جلوس تھا
جو حاکم کی آنکھوں میں
روندھ رہا تھا
محل خانے کے محافظ نا کے

جہاں کوئی حرکت نہیں تھی

وہاں کا ہنگامہ

خبروں میں چھایا تھا

جہاں جلوس کی گرج تھی

وہاں کا 'میوٹ شارٹ'

پورے دن کے حالات پر

کر رہا تھا تجزیاتی تبصرہ

تاثرات کا ایک جلوس

خبر بینوں کے ذہنوں کو

روندھ رہا تھا

'کشیدہ لیکن قابو میں' والے حالات کے بیچ



بلبلہ

بہت چھوٹا سا اِک
بلبلہ ہوں پانی کا
سمندر رڈور ہے
جس سے بندھی ہوں
اِک لہر کے کوہ سے
ایک لامحدود حرکت میں

یہی حرکت کی بھٹی ہے
جہاں چہرے جسمتے ہیں
جہاں چہروں کے پس منظر میں
بے چہرہ تعارف ہیں
میں آکاروں کا تاثر ہوں
میں ہی ناموں کی ہوں پہچان
سمندر سے جدا بھی ہوں
سمندر کا ہی حصّہ ہوں



چاند اور سورج

اپنے گھر کے کھنڈروں پر
واویلا
اِک اکیلا چاند آدھا
آسمان سے کہہ رہا تھا
'مرحبا'
صبح کا اُجلا دُشالہ اوڑھ کر
راستوں سے میں نے پوچھا
اِک نئی اونچی عمارت کا پتہ
نیلے نب پر
تازہ سورج نے لگایا
قہقہہ



چلہ

میرا چلہ
مجھے ہر شئے کے ساتھ
بانٹ رہا ہے
اور بنٹتے بنٹتے
رہ جاتا ہے
صرف چلہ
میری قبولیت کا ثبوت

تم مجھے ڈھونڈو

توچِلہ اپنی چُپی کی مملکت میں

تمہیں بانٹنا شروع کرے گا

اور بنٹتے بنٹتے رہ جائے گا

صرف چِلہ

تمہاری قبولیت کا ثبوت

عشق چِلہ مانگتا ہے

اور چِلہ خانقاہِ عشق میں

مِنّتوں کے دھاگوں سا

بندھا رہتا ہے



باز دید

میرے لوٹنے کے بعد
برس ہا برس لوٹ گئے
اور تم باز دید کے لئے نہیں آئے
میری پتھرائی آنکھوں سے
لمحے گرتے رہے
اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا
کہ میری گٹھری خالی ہو چکی ہے
اور اب کچھ دنوں کے بعد
میرے گھر میں ایک بُت ہوگا
جو تمہارے ایمان کا امتحان لے گا



خلیل جِبران کیلئے نظم

تم جس تپتی خُشک ریت میں
اپنے فِقر کے چند دانے
بو کر چلے گئے تھے
وہیں میں نے اپنا بستر بچھا دیا تھا
وہیں میں نے اپنی نمی سے
مِٹی تخلیق کی تھی
وہیں میں نے افزائش کا سکون پایا تھا

وہیں تمہارے تصوّرات کے پاگل کو
میں نے اپنا سرور بنایا تھا
اور ہم دونوں نے جنم دیا تھا
اُس برگزیدہ کو
جس کے چرچوں کو
تم نے
زمانے کے شوروغل میں
کھو جانے کیلئے چھوڑ دیا تھا
تم جس تپتے بنجر میں
بھوک کے عذاب کا صلہ
سونپ گئے تھے ریت کے دانوں کو
میں نے وہاں نظم کیلئے
بلند روزے رکھے
اور تمہاری نقل مکانی کا راز
اپنے سینے میں دفنا دیا

تمہارے ریگزار میں

میری نظموں کا آباد نخلستان ہے

تمہارے اندر کی چھٹپٹاتی ریت

دوپہر کی تپش سے مفر چاہے

تو بے جھجک آجانا

میری نظم کی چھاؤں میں

اور کھلنے کی اپنی صلاحیتوں کا

کرلینا ایک بار پھر اعلان



سیاہ رقص

روشنی کے تمام راستوں پر
اندھیرے کی تاریں بچھی تھیں
میں نے خود کو اندھیرے کے حوالے کیا
اور سورج تک کا سفر طے کیا
میں اب نورانی کرنیں اوڑھ کر
سیاہ رقص میں محو ہوں
میرے وجود سے پسینے کی مٹ میلی بوندیں گِر گِر

روشنی کے ذروں میں
بلیک ہول کی عِبارت لکھ رہے ہیں
خلا کے تمام راستوں پر
کوئی خموشی کا چھنکا بجاتا
ازل کے نغمے گا رہا ہے
میں انہی نغموں کی حرکتیں
اپنے رقص کو سونپتی ہوں
اور تخلیق کا حصہ ادا کرتی ہوں



اشتہار

عیون کی سلطنتِ دید
گلشنِ مظاہر کے ذرّے ذرّے میں
بوتی ہے دبدبۂ خار کا خوف
اور دُخترِ حوّا کے رنگ برنگے
من بھاؤنے چمن زار
اشتہارِ زمانہ ہوجاتے ہیں

ماں دعا کے ہاتھوں سے
ڈھک لیتی ہے اپنی چھاتیاں
بیٹی سر کے پلو سے
اَندھی کر دیتی ہے اپنی نظریں
اور ادا کرتی ہے عورت ہونے کی اُجرت
اشتہار کی سطر بندی میں
حوّا کی بیٹی کا پوسٹر چھپتا ہے

اشتہار کی تہذیب
نامۂ اسعار سے تعارف پاتی ہے
جو نمائش کیلیے لٹکائے گئے ہیں
مردانگی کی تمام کیلوں پر

سغال گری کا پیشہ معنی بدلتا ہے
برتنوں میں جھوٹن پروس کر بیچی جاتی ہے

میں اشتہار کے آسمان پر
لٹکنے والی ذات نہیں ہوں

میں ارضِ آدم پر گردش کرنے والی
ایک ایسی آوازِ بلند ہوں
جس کیلئے لغتِ زمانہ
معنیٔ لطیف کی تلاش میں ہے
اور تلاش کی اس سعی میں
اولادِ آدم کا اشتہار چھپنے لگا ہے

نئی روشنی کی چکا چوند میں
اشتہاروں سے اُتر رہی ہیں
دھڑا دھڑ
حوّا کی بیٹیاں



دیباچہ

ایک تلمیح کی مینار کی اونچائیاں

طبقہ طبقہ

کردار در کردار

بیان وعمل کی پازیبیں جھنکاتیں

آسمان سے اُترتیں

زمین میں

بے صدا

دیہاتی مکالمے کے الھڑپن تک

تخلیق کی مضبوط دیوار سے
ٹیک لگائے خالق
ایک دیباچے کی طرح پڑا یا
خود سے خود کو متعارف کراتا ہے

تلمیح اسی تعارف کی اوٹ میں
اپنی تمام تر رفعتوں کے ساتھ
چھُپ جاتی ہے
یہی چھُپنا اور مشتہر ہونا
اَن کہی تخلیقات کا دیباچہ ہے



ندی بھہ رھی ھے

ندی بہہ رہی ہے
میرے من میں اُمیدِ باراں
کہ کوہِ یخ کی تمام نوکیں
گرم دنوں پر
بلند آواز میں ہنس رہی ہیں
ندی بہہ رہی ہے

ہنسی کے ٹھہاکے
نرم پانیوں سے گلے مل رہے ہیں
"وصل کی یہ گھڑیاں گرم ھی رھیں گی"
سرد موسموں کی رُتیں کہہ رہی ہیں
ندی بہہ رہی ہے



ضابطے اور هم

ضابطوں کی ایک تیز رفتار آندھی آئی
اور میرے بے ترتیب کناروں سے ٹکرا کر
میری مملکتِ ذات کے اندر تک
ایک تباہی بن داخل ہوئی
میری اپنی آوارگی کے ٹھکانے اور

اپنے تمام اسرار و عیوب و انوار
مٹ میلی گھُس پیٹھ نے
نمائش کے چوراہوں پر
ننگے بکھیر دیئے اِدھر اُدھر
ضابطے تہذیب کے وہ سینگ ہیں
جواب میرے عناصرِ ذات کے سروں پر
ناگہاں اُگ رہے ہیں
اور میرے اشرف المخلوقات ہونے کے دعوے کی
اُڑا رہے ہیں کھِلّی

میں نے جتنا حدود کے اندر باہر
کھُلا چھوڑ رکھا تھا
وہاں کی سیاحت کا خوب چرچا تھا
سرگرمی تھی
میری تکمیل کے راستے موجود تھے

اب تمام وہ جگہیں

معیاروں کی نظر چڑھ گئی ہیں

جہاں ہم نہیں اِمکانات رہتے ہیں

آؤ، ایک جیسے کپڑے پہننا چھوڑ دیں

آؤ، الگ الگ دستر خوان بچھا دیں

آؤ، ایسی زبانوں میں بات کریں

جو ایک دوسرے کو سمجھ نہ آتی ہوں

آؤ، کچھ ایسا کریں

کہ ایک دوسرے کو بہت عجیب لگے

ضابطے اپنی قوتِ ذات پر

شرمندہ ہو جائیں خود بخود

اور پھر اٹھا سکیں ہم

اشرف المخلوقات ہونے کی آواز



میرا انتظار

تم مجھے اچھے نہیں لگتے
فصل کٹائی کے دنوں کی بارش کی طرح
اور پھر جب فصل کٹ جاتی ہے
میں سوکھے دنوں کے آئینوں میں
تمہیں تلاشنے لگتی ہوں
عکس در عکس
چھپ جاتے ہو تم
میری ہی نظروں کی اوٹ میں
اور دِکھائی نہیں دیتے

میرا انتظار
بوائی کیلئے تیار کھیت ہیں!



بچّے اور ہم

بچّے بے خبر ہو کر
چہک چہک رہے ہیں
اور پرندوں کی طرح
بہت اونچی اڑانیں بھر رہے ہیں
ہواؤں میں جھومتی
صنوبر کی ڈالیوں کی لَے کے ساتھ
ہم آہنگ ہو کر بچّے جھولوں کی طرح
جھول رہے ہیں اپنی اُمنگیں

گھاس کے تنکے
اپنے معصوم و نازک تنوں کو
زمین کی تمام ہریالی سے سیراب کرر ہے ہیں
بچّوں کی ہی طرح۔
موسموں کی تبدیلی
بچّوں کے ذائقے بدل دیتی ہے
اور بچوں کے بدلے ذائقوں سے ہی
موسموں کی پہچان قائم ہے
ہم پوتھیاں کھولے
عِلم کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں
بچّوں کیلئے



فریم

فریم سے اُتر آیا
میری تنہائی بانٹنے میرا کل
اور میرے آج کو
ماضی کر گیا

میں ایک فریم کی طرح
سوکھے پھولوں کی مالا پہنے
جی رہی ہوں
اور محسوس کر رہی ہوں
آنے والے لمحوں کی اگر بتیوں کی مہک !



کربلا

(تین مختصر نظمیں)

❶

سب رنگ ہوئے بے رنگ
نِکھرا ہوا ہے بس لال
تصویر ہے اِک چہرہ
لالی میں نہایا لال

❷

شمشیر ہے سجدہ گاہ
صلوٰۃ کے معنیٰ سَر
جب آگ ہو سینے میں
تو سرخ ہی ہونگے پَر

❸

فُرات ہے قدموں میں
صحرا کا بدن تَر ہے
اس غم کے اُجالے میں
راتوں کا سمندر ہے



ھے اک تسبیح

ابھی واضح نہیں ہیں
خال وخد ارض وسما کے
ابھی پانی تو ہے ہر سُو
روانی اُس میں باقی ہے
ابھی ہے روشنی لیکن
نابلد ہے وہ بصارت سے
ابھی اعلان ہے نہ عہد و پیماں

ابھی کرم و فضل نہ خلق و عطا ہے

ابھی سب کچھ

حجابوں سے پَرے ہے

ہے اِک تسبیح

زمانے گھومتی ہے

بہا جاتی ہے بے صورت وہ دریا

جہاں خالق ہے غوطہ زن مسلسل

طہارت کے وہ پاکیزہ سے قطرے

میرے چہرے پہ گرتے جا رہے ہیں

کہ عمرِ خلق کے سارے اِرادے

میرا من طور کرتے جا رہے ہیں



تماشائے اطفال

اپنی آنکھوں سے
آنکھیں ملا کر
شناسائی کی لذّت پاتی رہی
اور لحظہ بہ لحظہ
اسی لذّت پر قربان ہوتی رہی

درجہ بہ درجہ

انتقال کرتی رہی

اس تماشائے اطفال کو
مرگِ احمقاں کہنے والوں کے
سروں کے بہت اُوپر
میرا مرقد ہے
جہاں میں درجہ بہ درجہ
نور کی عزاداری میں
سیاہ توانائی کے
پڑاؤ در پڑاؤ طے کر رہی ہوں
نفس شناسی کی جھولی میں
تجرّد باندھ رہی ہوں



تماشائے اطفال

اپنی آنکھوں سے
آنکھیں ملا کر
شناسائی کی لذّت پاتی رہی
اور لحظہ بہ لحظہ
اسی لذّت پر قربان ہوتی رہی
درجہ بہ درجہ

انتقال کرتی رہی

اس تماشائے اطفال کو
مرگِ احمقاں کہنے والوں کے
سروں کے بہت اُوپر
میرا مرقد ہے
جہاں میں درجہ بہ درجہ
نور کی عزاداری میں
سیاہ توانائی کے
پڑاوٗ در پڑاوٗ طے کر رہی ہوں
نفس شناسی کی جھولی میں
تجرّد باندھ رہی ہوں



کلمۂ تمنا

دعا کے لئے ہاتھ اُٹھے!
بہت دیر کے بعد
بنسی کی تانوں نے
جامِ وَصل سے پیالے بھرے

نشہ سجدہ گاہ سے اُٹھا
اور طہارت کی نیّت میں
سمٹا یہ پورے کا پورا

دارالیقین

تبھی راس کرتی ہوئی گوپیوں نے

سروں سے

دُپٹے گرا کر

طوامیرِ عشق وقبولِ اطاعت کی تشہیر کردی

دعا کے لئے ہاتھ اٹھے!

بہت دیر کے بعد

تاروں کے جھُرمٹ سے

پریوں نے جھانکا

بہت دیر کے بعد

معصوم بچوں نے

آنکھوں کے آنگن میں

ہلّہ مچایا

سیاھی کے تار

جو سیاہی کے تار
میری آنکھوں میں تیر رہے مکڑے نے بُنے تھے
وہ میرالبادہ ہو گئے
اور منسوب بہ جہاں ہو گئے
اُجالے میرے خرقے پر
ستاروں کی مانند جُڑے
میں فِضا و خِلا کی حدود کے حوالے

سیاہی کی دَمک پر اِترا رہی ہوں
لہر بہ لہر میرا سیاہ خرقہ
ستاروں کی اقلیت پر نازاں
اپنے اندر چھپائے
ایک بہت بڑا حلقۂ حرکت
وُسعت پا رہا ہے

کوتاہ بین
دیکھ کر چند ستارے
عالمِ نور کے چرچوں میں محو ہیں
دور اندیش
اپنی آنکھوں کے لئے
سیاہی کے تار بُننے والے
مکڑوں کی تلاش کر رہے ہیں



بوجھ

پیاس کا بھرا پورا دریا
جب میں نے
اپنی خواہشات کے ریگزار میں بہا دیا
تو سفر کے ہر پڑاؤ پر
من بھاؤنے نخلستان وجود میں آئے
جہاں میرے ساتھ ساتھ
ہر ڈھیرے پر ستانے بیٹھ جاتے ہیں
میرے اندر بڑھتے ہوئے جلوس

اور ہر بار سفر کی نئی شروعات پر
میں اپنا بوجھ کم کر کے چل نکلتی ہوں
سفر در سفر
کم ہوتے بوجھ کے بعد
جب آج میں
اپنی پیاس کے دریا میں
نہانے اُتری
تو میرا وزن پانی سے کم تھا
اب میں غسل کی مجبوری سے آزاد ہوں
اور اِس آزادی کے احساس کا بوجھ
ہلکا کر رہی ہوں



میلہ

تماشوں کے کرشموں کی رفعتوں سے
اُترتا ہی نہیں من زمین پر......
بِنا سہارے کے
رسّی پر چلنے والی بھاری بھرکم لڑکی
میری آنکھوں کی حیرانی میں
ڈُبکیاں لگا رہی ہے
آگ کے چھوٹے دائروں سے نکلنے والے
ربڑ نما تن

میرے ماتھے کی سِلوٹوں میں بس گئے ہیں

میلہ

شور کے بیچ حیرت بانٹتا ہے

میلہ

بازار کے پنڈالوں میں حسرتیں بیچتا ہے

میلہ

بھیڑ کے ہنگاموں کی چھاتیوں میں

گھونپتا ہے اضطراب کے خنجر

قطرہ قطرہ

خموشی میں بہتا ہے

بہکاوے کا لہو

جسکا الزام ہر شریک

گھر لے جاتا ہے میری طرح



مچھلیاں

وہ جھیل
دراصل میری آنکھوں میں تیر رہی
سیاہی کے خوف سے ہی
اُتر آئی تھی
تمہارے دیس کے نگر
جہاں تم مجھے لے گئے تھے
اللہ کو رجھانے والے پُر لَے نغمے سُنانے
اور وہیں پُرسکون کناروں پر بیٹھ
تم نے آتی جاتی

رنگ برنگی مچھلیوں کی سرمستی کی طرف
متوجہ کیا تھا مجھے

اور کہا تھا کہ مچھلیاں پریاں ہوتی ہیں
اور پریاں جب گاتی ہیں اللہ کو رجھانے والے نغمے
تبھی جھیل سانس لیتا ہے

میں نے اُن پریوں کی گفتگو سنی
تو آنکھوں کے جھیلوں میں
زندگی کی حرکتیں محسوس کی تھیں
کچھ مچھلیاں اپنے نغموں کی حرکتیں سونپ کر
گہرے میں چھپ گئی تھیں
اور میں جھیل کے کنارے مچھواروں سے بچاؤ کی نگرانی کی
عبادت میں کھڑی ہوں
تب سے



آنکھیں

برسوں تک
آنکھوں نے کتنے نظارے
بکھیر دیئے تھے آس پاس
اُنکی سیاحت کی خماری میں
دید کے بہکاوے کی عادت پڑ گئی تھی تمہیں
اور تم کردار در کردار ادا کرتے رہے
بڑی مہارت کے ساتھ

آنکھوں کے ہر عکس سے میل کھاتے نظارے

مجھے، زمانے کو اور پھر خود کو بہکاتے بہکاتے

بھول گئے کہ تم اصل سے دور

جیتے جا رہے ہو اصل کا اُلٹا عکس

میں نظاروں کے سراب کو جانتی ہوں

اور زمانہ نظاروں کا سراب ہی ہے

تم اکیلے رہ گئے ہو

آنکھوں میں جمع کرتے جا رہے ہو کچرا

اور کچرے کی باس

تمہاری دید کا دم گھونٹ دے گی

پھر کس عکس کو کہاں قید کرو گے؟

اور کس سے مانگو گے

رات کی آنکھیں

اُجالوں کے لئے



هتھیلی پہ سورج

مُٹھی بھر آسمان کی سوغات دیکر
جوگی اندھیرے کے جنگل میں چلا گیا
آنکھوں میں چراغوں کا جلوس لئے ہوئے

میں اُجالے کے دیس
بھٹک رہی ہوں
ہتھیلی پہ لئے سورج
اندھیروں کا خوف
کِرن کرن تعاقب کر رہا ہے میرا



تمھاری نظر

تم نے پہلے آنکھوں میں بسالیا
مچھلی گھر
اپنی دید کے پانیوں میں پال لیں
رنگ برنگی مچھلیاں
ہر چھپاک حرکت کے ساتھ
تمہارا من طیش میں آتا
اور ماہی گیر ہو جاتا

اب تمہارا من مچھلی ہو گیا ہے
اور آنکھوں کے تالاب میں
اُسی کی حرکتوں کا ارتعاش ہے
تمہاری نظر تبھی مجھ تک نہیں آتی

چھلانگ

پہلی، دوسری اور تیسری سمت کے سفر کے دائیرے
بلاخر آپس میں مدغم ہو گئے
اور رفتار پیروں کی پازیب ہو گئی
اور بجتی رہی چھَن چھَن

چھنک کی لذّت
لحظ بہ لحظ

مسافروں کی شانِ بے نیازی پر بھاری پڑی
تو قدم ٹھہر گئے
یک لخت
پھر ٹھہراؤ کا لمحہ یُگ ہو گیا
اور بے حرکتی ایک چھلانگ ہو گئی
جو کسی اور دائیرے کے سفر سے جا ملی
اور پازیب کی چھنک ہو گئی

یہ سفر کے دائیرے
کود کے قدموں کی رفتار سے طے ہوتے جا رہے ہیں
اور بے حرکتی کی لذّت ہی اِس سفر کا حصول ہے



HATHELI PE SURAJ

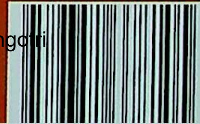
Urdu Poetry Collection

DR DARAKHSHAN ANDRABI

... خطہ کشمیر بلکہ پوری اردو دنیا کی ایک ایسی
... کے نام کا آفتاب جلوہ آفاق پر تاباں
... مصنف ... ہیں۔ محترمہ نے یوں تو کئی
اصناف ... کارانہ، ہنر ورانہ، خلاقانہ
... کارانہ اور ساحرانہ جلال ... اور کمال کا دل فریب مظاہرہ کیا ہے۔
لیکن ان کا سب سے مضبوط حوالہ یا دل پسند ترجیحات آزاد نظم اور صنفِ
غزل ہی ہیں۔ درخشاں اندرابی نظم کی ایک ایسی ہی شاعرہ ہیں جو درونِ
ذات اور کائنات پر مبنی اپنے تجربات و مشاہدات اور نازک ترین
احساسات کو علامات و استعارات کی زبان میں کچھ ایسے دلکش اور موثر
اسلوب میں بیان کرتی ہیں کہ ان کی جدت وندرت کا طلسم کدۂ حیرت
دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ وہ اظہارِ بیان کے طور پر جو الفاظ اور استعارات
انتخاب کرتی ہیں وہ ان کے موضوع اور خیال کی معنویت کے ترسیل و
ابلاغ کی راہ میں رخنہ انداز نہیں ہوتے ہیں اور شاعرہ کے اندرون میں
ہلچل پیدا کرنے والے متلاطم جذبات واحساسات قارئین کے دلوں میں
خود بخود منتقل ہو کر انہیں اپنے شکنجے میں کس لیتے ہیں۔ درخشاں اندرابی
ایک ایسی ماہرِ فن شاعرہ ہیں جنہوں نے درجنوں معرکتہ الآرا اور شاہکار
نظمیں تخلیق کر کے اپنے آفرید گارانہ وسخنورانہ اور خلاقانہ وساحرانہ جمال و
کمال کے دریا بہا دیے ہیں۔ ڈاکٹر درخشاں اندرابی کثیر الجہات
موضوعات کی شاعرہ ہیں۔

رئیس الدین رئیسؔ

ISBN 978-93-5137-810-5



Rs: 500/=